بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق کی تازہ تقریر کے پیچھے بھی حسب سابق ایک مخلصانہ جذبہ ضرور کارفرما ہے، مگر مسائل اتنے پیچیدہ ہیں اور مختلف مشوروں کی بوچھاڑ ان پر ہر چہار جانب سے اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ تازہ تقریر میں فکر کے کئی خطوط ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔

مثلاً اُن کا ایک ارشاد یہ ہے کہ:

"اسلامی زندگی کا آئین جو ۱۴سو سال پہلے نافذ ہوا تھا، آج بھی نافذ ہے۔ اسے کسی نے منسوخ نہیں کیا۔ نہ ہی کسی ایک فرد یا گروہ کے ہاتھوں دوبارہ نافذ ہونے کا محتاج ہے۔"

"اگر یہ نظام منسوخ ہوچکا ہوتا تو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے فرائض منسوخ ہوچکے ہوتے۔"

اس معنی میں تو اسلام برصغیر میں انگریزی حکومت کے سائے میں بھی نافذ تھا کہ اسلام کو یا نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کو کبھی منسوخ نہیں کیا گیا۔ چنانچہ قادیانیوں کے سربراہ اوّل نے انگریزی حکومت کی اطاعت اور اس سے تعاون کو شرعاً لازم قرار دیا۔ اس وقت بھی اگر اسلام کو بالفعل نافذ قرار دیا جائے تو تحریک مجددی سے لے کر تحریک خلافت تک جتنی بھی احیائے اسلام کی تحریکیں یہاں چلیں، ان سب کا مقصد و مدعا از سرِنو طے کرنا پڑے گا۔ بلکہ خود تحریکِ پاکستان کا بھی کوئی نیا مقصد تجویز کرنا لازم ہوگا۔ کیونکہ اگر تحریکِ پاکستان کا نصب العین اسلام، اسلامی قانون اور اسلامی تہذیب کا

احیاء تھا تو پہلے سے نظامِ اسلامی کے نفاذ کا نظریہ بدلنا پڑے گا۔

کیونکہ:

"کچھ لوگ سرے سے اسے اپنی عملی زندگی سے تقریباً خارج کر چکے تھے"...... اور

جو اس پر عمل پیرا ہیں وہ بھی زیادہ تر اس کی مقرر کردہ عبادتوں پہ اکتفا کرتے ہیں"۔

"اور اس کا سماجی، اقتصادی اور معاشرتی پہلو پس منظر میں چلا گیا ہے"۔

اسلام کا عملی زندگی سے خارج ہو جانا اور اس پر عمل پیرا ہونے والوں کا بھی محض چند عبادتوں پہ عمل پیرا ہونا ایک ایسا بیان ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے اسلام کا بڑا حصہ، خصوصاً سماجی اور اقتصادی امور عملاً نافذ نہیں رہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ اسلام کا بہت بڑا حصہ ایسا ہے جسے عملاً نافذ کرنے کے لیے ایک نئی کوشش کی ضرورت ہے۔ اس نئی کوشش کی کچھ ذمہ داریاں فرد پہ بھی آتی ہیں، علماء اور مصلحین امت پر بھی آتی ہیں، اور حکومت وقت پہ بھی عاید ہوتی ہیں

یہاں پہنچ کر اس جملے کا مفہوم متعین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ:

"نہ ہی کسی ایک فرد یا گروہ کے ہاتھوں (اسلام) دوبارہ نافذ ہونے کا محتاج ہے"۔

یہ جملہ تو فرد اور گروہ دونوں کو سبکدوش کر دیتا ہے کہ تمہارے ذمے اسلام کے اجرا و نفاذ کے سلسلے میں کوئی بارِ فرائض نہیں ہے؟

اب شروع سے یہاں تک کے اجزائے کلام کو زیرِ غور لا کر دیکھیے کہ بات کیا بنی؟

ہمارے یہاں بہت سے لکھنے اور بولنے والوں کے طرزِ بیان سے یہ مغالطہ عام ہو گیا ہے کہ اسلام حضور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آیا اور نافذ ہوا۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ اسلام حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ انسانیت تک پہنچا، آپ کے ہاتھوں سے نافذ ہوا، اور پھر جب بھی وہ عملاً زندگیوں سے خارج ہوا یا دوسرے غلط رجحانات اس میں خلط ملط ہو گئے اور علمی و دعوتی لحاظ سے اس میں تحریف ہو گئی تو پھر کسی نئے رسول و نبی نے تجدید و احیاء کا کام کیا۔ حضور خاتم النبیین کے بعد مجددینِ اُمت اور علماء و صلحا نے بار بار اسے تعلیمی و فکری لحاظ سے

واضح شکل میں پیش کیا اور عملاً یہ کوشش کی کہ اس کے احکام اور ادارے بحال ہو جائیں۔

اسی معنی میں ہمارے ہاں ایک اصطلاح اقامتِ دین کی رائج ہے جس کی بنیاد قرآن کے اس مطالبے پر ہے کہ "اقیموا الدین" (الشوریٰ - ۱۳) دوسری اصطلاحیں تجدید دین اور احیائے دین کی متداول ہیں جن کی بنیاد احادیث پر ہے۔ بلکہ ایک اور اصطلاح محی الدین کی بھی اسلامی لٹریچر میں شائع و ذائع ہے جو احیائے دین کے تصور پر مبنی ہے۔ ان ساری اصطلاحوں کا مطلب یہ ہے کہ دین جب کبھی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں پر اپنا غلبہ کھو بیٹھے، دینی حقائق واضح نہ رہیں، صحیح اور غلط خیالات گڈ مڈ ہو جائیں تو ہر صاحبِ ایمان و شعور فرد کا، اور ہر دینی گروہ کا اور اسلام کے لیے کام کرنے والی ہر حکومت کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ دین کی دعوت دے، دین کے اصول و حقائق کو شکوک و اوہام اور بدعات و منکرات کے گھیروں سے نکالے، اور عملاً دین کے عقائد و عبادات، احکام و قوانین اور آداب و شعائر کو غالب کرنے کی سعی کرے۔ اسی لیے کسی کو صدی کا مجدد اور کسی کو ہزار سال کا مجدد قرار دیا جاتا ہے۔ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کو محی الدین کا لقب دیا گیا ہے۔ یہی الفاظ مشہور بادشاہ اورنگ زیب کے لیے بھی استعمال ہوتے۔

قرآن نے "اقیموا الدین" کے مطالبے کو دوسرے لفظوں میں بھی بیان کیا ہے، حضورؐ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ "لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ" یعنی ان کے ذمے یہ خدمت ہے کہ وہ خدا کی ہدایت یا دینِ حق کو دوسرے تمام ادیان و مسالک کے مقابلے میں عملاً غالب کر دیں۔

غلبۂ دین اور اقامتِ دین کی سعی کا یہی فریضہ امت کے ہر فرد اور مسلم معاشرہ کی ہر جماعت اور ہر حکومت پر عاید ہوتا ہے۔

ہمارے محترم جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کو اس فریضہ سے بھی انکار نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

"ہمیں جو ملکی قوانین ۱۹۴۷ء میں ورثے میں ملے تھے وہ ایک غیر ملکی اور غیر اسلامی حکومت کے وضع کردہ تھے .... موجودہ قوانین کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی۔"

پھر مثبت پہلو سے خود زور دیتے ہیں کہ:

"بنیادی طور پہ چار شعبوں میں کام کرنے کی ضرورت ہے: سماجی، اقتصادی، تعلیمی اور تعزیری"۔

لیکن پھر پلٹ کر وہ یہ فرماتے ہیں کہ:

"ان شعبوں میں خاص طور پہ سماجی شعبے میں اسلام پہ عمل کرنے کے لیے کسی قسم کے سرکاری احکامات کی ضرورت نہیں ہے۔ ضابطۂ اخلاق پہلے سے موجود ہے۔ اگر سوا سات کروڑ افراد اپنی روزمرہ زندگی میں پانچ وقت کی نماز کی عادت ڈال لیں اور عملی زندگی میں اسلامی ضابطے کو اپنا لیں تو عملی طور پہ اسلامی نظام خود بخود نافذ ہو جائے گا"

یہ بات کچھ ایسی ہی لگتی ہے جیسے کوئی ہیلتھ افسر بیان دے کہ اگر لوگ صفائی کے پابند ہو جائیں، خراب غذائیں کھانا چھوڑ دیں، ہوا خوری اور ورزش کی عادت ڈالیں تو صحتیں خود بخود برقرار رہ جائیں گی۔

انسان کی سماجی و اخلاقی زندگی کی بڑی مشکل یہ ہے کہ یہاں خود بخود کچھ نہیں ہوتا، بلکہ اصلاح کی ہر بات کے لیے کسی نہ کسی کو اُٹھ کر اس کے لیے آواز بلند کرنی پڑتی ہے، لوگوں کو قائل کرنا ہوتا ہے۔ پھر تربیت سے ان میں عادت پیدا کرنی ہوتی ہے۔ دوسری طرف ایسی تدابیر بھی سوچنی پڑتی ہیں کہ گھروں، تعلیم گاہوں اور پورے معاشرہ کے عمومی ماحول میں ایسے محرکات موجود نہ رہیں جو غلط سمت میں لے جانے کے لیے دباؤ ڈالتے ہوں بلکہ بالکل برعکس صورت میں ایسے عوامل پیدا کیے جائیں کہ بچوں اور بڑوں کو صحیح سمت میں بڑھنے کے لیے آسانیاں پیدا کریں۔

نظریاتی طور پہ جب مسلمانوں کے لیے شراب یا چوری کو حرام کیا گیا ہے تو شراب یا چوری کو مسلم معاشرے میں خود بخود ختم ہو جانا چاہیے، مگر ایسا عملاً تو ہوتا نہیں۔ تعمیری اصلاح کی کچھ مساعی تعلیم، ترغیب، ترہیب اور تربیت سے کی جاتی ہیں، مگر ساتھ کے ساتھ شراب اور سرقہ کا قانونی انسداد بھی کیا جاتا ہے، اور جو لوگ نہ تعلیم و تلقین کے ذرائع سے اثر قبول کریں اور نہ قانون کے خوف سے غلط حرکات سے باز رہیں، اُن کو سزا بھی دینا پڑتی ہے۔ یعنی اسلام کی اصلاحی اسکیم کا ایک سرا اگر تعلیم و تلقین ہے تو دوسرا تہدید و تعزیر۔ یہ دونوں تدابیر مل کر ہی صحیح نتیجہ پیدا کرتی ہیں۔ ایک کوشش،

دوسری کے بغیر ادھوری رہ جاتی ہے اور ناقص اور کمزور نتائج دیتی ہے۔

اس مفروضے کے حق میں کوئی ایک تاریخی مثال بھی نہیں مل سکے گی کہ کسی معاشرہ کے پورے کے پورے یا بیشتر افراد نے یہ جان کر خود بخود نماز شروع کر دی ہو کہ اس کا حکم خدا نے دیا ہے۔ دعوت دینے والی قوت دیر تک کام کرتی ہے، مخالفِ نماز محرکات و موانع کو روکتی ہے۔ ترغیبی عوامل کو بڑھاتی ہے، اور کم سے کم سرکاری اداروں اور دفتروں میں اقامت صلوٰۃ کے حکم کو ضابطۂ ملازمت کا جز بنا کر افسران کو اس کے نفاذ کا ذمہ دار بناتی ہے اور اس معاملہ میں ان کی کارکردگی کے مطابق ریمارکس اُن کے فائلوں پہ درج کرتی ہے۔ سرکاری ملازمتوں میں آنے اور ترقی پانے والے افراد کا ریکارڈ بسلسلہ اقامت صلوٰۃ دیکھ کر اور اہم مناصب پہ آنے والوں کے حلف میں اقامتِ صلوٰۃ کے وعدے کو شامل کرا کے وہ معاشرے کو نماز کا پابند بنانے کی کوشش کرتی ہے۔

اس طرح کی بھرپور محنت کے بغیر ایک ایسے معاشرے کے کروڑوں افراد میں نماز کی ترویج کیسے ہو سکتی ہے جس میں لوگ سمجھتے ہوں کہ نماز کے بغیر بھی مسلمان اچھا خاصا مسلمان رہتا ہے اور تارکِ نماز ہوتے ہوئے بھی وہ مسلمانوں کی نمائندگی اور قیادت کر سکتا ہے اور بڑے سے بڑے عہدے پہ فائز ہو سکتا ہے۔

یہی صورتِ حال تمام دوسری خوبیوں کو پھیلانے اور خرابیوں کو مٹانے کی ہے۔

اسلامی نظام اصل میں چند متفرق اجزاء کا نام نہیں کہ فلاں کام پہلے افراد خود کر لیں اور اس کے نتیجے میں فلاں کام خود بخود ہو جائے گا، بلکہ یہ سارا ایک ہی مربوط کُل ہے۔ اسے نافذ یا غالب یا عملاً قائم کرنے کا عمل بیک وقت مختلف اطراف سے شروع کرنا ہوگا ہے۔ تعلیم کی جانب سے بھی، اقتصادیات کی اطراف سے بھی، سماجی پہلوؤں سے بھی، علمی و فکری دائرے میں بھی، نشرو ابلاغ کے ذرائع سے بھی، دفتری نظام کے واسطے سے بھی، اور دیگر تمام دوائر سے بھی۔

نظام کی تبدیلی کا کام ــــــــ خواہ وہ کتنی ہی پُرامن اور تعمیری و فلاحی نوعیت رکھتی ہو ــــ ایک جنگی کارروائی کی طرح سے ہوتا ہے۔ جتنی سپاہ کو اس کے لیے ترتیب دی جا سکتی ہو، اسے

کمانڈر میدان میں اتارتا ہے اور ایک نقشۂ جنگ سامنے رکھ کر زور شور سے اپنی کارروائیاں انجام دیتا ہے۔ یہ گرما گرم رزمی کام اگر بزم آرائی کی شکل اختیار کرلے تو بات نہیں بنتی۔ یہ تو ایک نوعیت کا جہاد ہے۔

جس طرح فوجی کارروائی کے لیے اسکیم (SCHEMING) ضروری ہوتی ہے، اس طرح تیز رفتار کارروائی (QUICK ACTION) بھی لازمی ہوتا ہے۔ پھر جس طرح فوجی اقدام ہمہ جہتی (ALL ROUND) قسم کا ہوتا ہے۔ اسی طرح تبدیلیٔ نظام کا کام بھی ہمہ جہتی ہوتا ہے۔

ایسے بڑے اور جامع کام کے متعلق ہمارا یہ خیال کرنا صحیح نہیں کہ بس چند اجزا ہیں جن کو نسخے کے مطابق ایک ایک کرکے بوتل میں ڈالنا اور مکسچر تیار کرنا ہے، اور یہ تو اور بھی زیادہ پیچیدہ بات ہے کہ فلاں فلاں جزمل جائیں (یہ بھی ایک خواہشاتی طرز فکر ہے) تو باقی مکسچر خود بخود بن جائے گا۔ اور یہ سوچنا بھی صحیح نہیں کہ فلاں فلاں اصلاحات تو لوگ کرلیں، پھر فلاں کام حکومت کرے گی۔

حقیقت میں اسلام کے لیے کام کرنے کا جذبہ رکھنے والی حکومت کو تو احیائے اسلام کی مہم کی قیادت کرنی ہوتی ہے۔ افراد سے جو کام لینے ہوتے ہیں اُن کے لیے بھی وہ محرکات فراہم کرتی ہے اور مزاحمتوں کا خاتمہ کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں افراد سے ان کے رضاکارانہ جذبے کو اُبھار کر لیے جانے والے کاموں کو بھی احیائے اسلام کی پوری اسکیم میں رکھنا ہوتا ہے۔ جیسے آپ اقتصادی ترقیاتی منصوبہ میں پبلک سیکٹر اور پرائیویٹ سیکٹر کے متعلق اپنے نقشے کے مطابق حالات کی نشوونما کا انتظام کرتے ہیں۔

محترم جنرل صاحب کا یہ نکتہ بہت واضح ہے، اور یہ پچھلے بعض جملوں سے پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کو رفع بھی کرتا ہے کہ:

" حکومت کے ذمے ایسے قوانین بنانا ہے جن کا تعلق افراد کی زیادہ تر اجتماعی زندگی سے ہوتا ہے"۔

فرد کی زندگی کا بہت بڑا حصہ اجتماعی دائرے میں ہوتا ہے، اور بقیہ حصہ بھی اجتماعی دائرے کے

احوال سے متاثر ہوتا ہے۔ لہٰذا اجتماعی زندگی کے لیے جو قانون سازی کی جائے گی وہ افراد کی انفرادی اور نجی زندگیوں کو بھی اپنے رنگ میں رنگتی جائے گی۔

اگر سابق قوانین کو بدلنے اور اسلام کے مطابق افراد کی اجتماعی زندگی سے متعلق اسلام کے مطابق قانون سازی کرنے کا کام حکومت کے سر عاید ہوتا ہے تو پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کسی فرد یا گروہ کے ہاتھوں اپنے دوبارہ نفاذ، یا قیام یا احیاء کے لیے محتاج نہیں۔

مجھے یہ عبارات پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ محترم جنرل صاحب کی نیت بالکل صاف ہے، البتہ جو بات وہ کہنا چاہتے تھے اس کو ترتیب دینے میں کہیں کوئی جھول رہ گیا ہے۔

ایک یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ:۔

"ایسے قوانین مرتب کرنے ہیں جو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے لیے قابلِ قبول ہوں۔"

یہ مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جن پر اسلامی قانون کے اجراء کے داعیان اور اس سلسلے میں کام کرنے والے محققین اور سیاسی ٹیموں اور مختلف فرقوں کے علماء نے برسوں سوچ بچار کی ہے۔ اب تک جو سوال اُٹھے اور بحثیں ہوئیں اور پھر اُن سے جو نتائج نکلے اُن کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو یہ شرط پوری ہونا شاید ہی دائرہ امکان میں ہو کہ قانون صرف وہ جاری ہو جس پر حنفی اور اہلحدیث ہی نہیں، شیعہ برادران بھی متفق ہوں۔ چند مسائل کو تجربے کے طور پر ان سارے مدارسِ فکر کے اکابر کے سامنے استفتا کے طور پر رکھیے اور دیکھیے کہ جوابوں میں کتنے بڑے فاصلے ہیں۔

۱۹۵۱ء میں جب تمام مدارس فکر کے جید و اکابر اور معتمد علیہ اور وسیع النظر علماء جمع ہوئے تھے تو انہوں نے اس بات پر سمجھوتہ کر لیا تھا کہ عام ملکی قوانین مسلم اکثریت کی فقہی تعبیرات کے مطابق بنیں گے، البتہ پرسنل لا کی حد تک کوئی بھی گروہ چاہے تو اپنی فقہ کے مطابق فیصلہ لے سکتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ محترم جنرل صاحب اس خاص مسئلے پر ایک بار پھر غور کریں۔

(باقی بر صفحہ ۲۲۴)